

مذکرہ علیہ

مسئلہ جبر و قدر

(۶) (۳۵۲ آ) (سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو اشاعت ماہ شعبان)

پس تقدیر پر عقیدہ رکھنے کی جو تعلیم قرآن حکیم میں دی گئی ہے۔ اس کا اصل مقصود یہ ہے کہ انسان دنیا کی تمام قوتوں سے حقیقی تاثیر اور نفع و ضرر کی قدرت کو سلب کر کے، صرف خدا کو فاعل و موثر، اور نافع و ضار سمجھے، اور اپنے سب معاملات میں اسی پر بھروسہ کرے۔ اگر مصیبت آئے تو مایوس نہ ہو۔ خود داری کے اعلیٰ مقام سے نگرے، مخلوقات کے سامنے ذلت نہ اختیار کرے، اور اگر راحت میسر ہو تو اس پر پھولے نہیں غرور و نخوت کو اپنے نفس میں جگہ نہ دے، اور خدا کی زمین پر سرکشی و تجبر نہ اختیار کرے۔ یہی بات ہے جو سورۃ الحدید میں بیان کی گئی ہے۔

مَا أَصَابَتْ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لَكِن لَّا تَأْتُوا عَلَى مَا قَاتَكُمُ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (۳)

جو مصیبت بھی زمین میں آتی ہے، یا خود تم پر نازل ہوتی ہے، وہ پیش آنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور یہ اللہ کے لئے ایک سہل سی بات ہے تم کو یہ بات اس لئے بتا دی گئی کہ جو کچھ نقصان تم کو پہنچے اس پر دل نہ ہو، اور جو کچھ خدا تم کو عطا کرے اس پر اترا نہ جاؤ۔

اللہ کسی اکڑنے اور اترا نے والے کو پسند نہیں کرتا۔

عقیدہ تقدیر کا فائدہ عملی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی زندگی کے تمام معاملات میں یہی

روح پھونکنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے کیونکہ اس سے اخلاق پر ایک خاص اثر پڑتا ہے، اور اگر لوگوں کے دلوں میں یہ چیز بیٹھی جائے، تو بڑے بڑے تمدنی، سیاسی، معاشی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں، بلکہ پیدا ہی نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر دو حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لا یحل لامرأۃ تسأل طلاقاً اجتہا لتستفرغ صحفتہا فانما لہما ما قدر لہما۔ کسی عورت کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی دوسری بہن (یعنی سوکن) کو طلاق دینے کا مطالبہ اس خیال سے کرے کہ اس کے تمقات اور خلوت میں کوئی دوسرا شریک نہ رہے، اور رزق کا پالا تنہا اس کے لئے خالی ہو جائے۔ اس لئے کہ بہ صورت اس کو وہی ملے گا جو اس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک غزوہ میں بہت سی لوندیاں ہمارے ہاتھ آئیں اور ہم نے ان سے تمتع کیا، مگر اس خیال سے کہ اولاد نہ ہو عزل کرتے گئے۔ پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم پوچھا۔ آپ نے سنتے ہی فرمایا۔ او انکم لتفعلون؟ کیا وہ تم ایسا کرتے ہو؟ یہی سوال آپ نے تین مرتبہ دہرایا۔ پھر فرمایا ما من نسمة کائنة الیوم والقیمة الا ہی کائنة۔ قیامت کے دن تک جو بچے پیدا ہونے میں وہ تو پیدا ہو کر ہی رہیں گے۔

ان دونوں حدیثوں میں جن اصول کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، اگر ان کو وسعت کے ساتھ ہم زندگی کے معاملات میں استعمال کریں، تو وہ معاشی کشمکش اور فراغت جس نے دنیا سے سکون و اطمینان پھین لیا ہے کس قدر جلد ختم ہو جائے۔ نہ کوئی کسی کو اپنے رزق کا چھیننے والا بکھے، اور نہ اپنے رزق کی حفاظت

لہ بخاری کتاب النکاح باب الشروط التي لا تحل فی النکاح۔ اسی کے قریب قریب بیہقی اور ابو نعیم اصبہانی نے دوسرے طریقوں سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ اہل علم کے نزدیک یہ حدیث ان تمام احادیث میں سب سے بہتر ہے جو تقدیر کے مسئلہ میں منقول ہیں۔ اس کا اشارہ یہ ہے کہ اگر شوہر عورت کی بات مان بھی لے اور اس عورت کو طلاق بھی دیدے جس کے متعلق وہ عورت یہ گمان کرتی ہے کہ وہ اس کے رزق میں شریک ہو جائے گی۔ تب بھی اس تدبیر سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کو صرف اتنا ہی حصہ ملیگا جتنا خدا نے اس کے لئے لکھ دیا ہے، خواہ شوہر اس کی شرط قبول کرے یا نہ کرے۔ تہ العزل، النزح بعد الاطلاق، منزل خارج الفرج۔ لہ بخاری کتاب النکاح باب العزل۔

کے لئے کسی کی مزاحمت کرے، نہ سرمایہ دار اور مزدور کا سوال پیدا ہو، اور نہ کسان و زمیندار کا، نہ کروڑ گروڈ
میل زہار و ف پیدا ہوں، نہ لینن اور شالین۔ نہ معاشی اور تمدنی مشکلات کو حل کرنے کے لئے انتظام
حل اور منع حل کی طرف رجوع کیا جائے، اور نہ اللہ کے انتظام میں اصلاح کی کوشش کی جائے۔

یہ اور ایسے ہی بیشمار اخلاقی اور عملی فوائد ہیں جو قضا و قدر کی اسلامی تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں
اور انہی فوائد کا حصول اصل مقصود بھی تھا۔ مگر ہماری بدہستی کہ ہم نے اس کے عملی اور اخلاقی پہلو کو نظر
کر کے اپنی ساری توجہات فلسفیانہ پہلو کی طرف پھیر دیں، اور اپنے مذاق طبیعت کے مطابق کلام اللہ
اور کلام رسول سے ان مسائل فلسفہ کو حل کرنے لگے جو کلام الناس سے ہم نے اخذ کئے تھے۔ حالانکہ نہ قرآن
مجید ہم کو ما بعد الطبیعیات کی تعلیم دینے کے لئے اتارا گیا تھا۔ نہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت
کا مقصد یہ تھا کہ آپ فلسفہ کے پروفیسر کا کام انجام دیں اور نہ خدا و رسول نے کبھی اس کو پسند کیا کہ ہم
اپنی زندگی کے عملی معاملات کو چھوڑ کر ان ما بعد الطبیعی مسائل میں الجھ جائیں جن سے دین یا دنیا کا کوئی فائدہ
حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

تناقض کی تحقیق | یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس سوال کی طرف آئیے کہ قرآن مجید میں خاص
تقدیر کے سلسلہ سے بحث کئے بغیر جو مختلف اشارات ضمناً دوسرے مباحث کے سلسلہ میں اس کی جانب
کنے گئے ہیں آیا ان میں حقیقتہً کوئی تناقض ہے یا نہیں؟

اگر کسی شے کو مختلف علتوں کی جانب منسوب کیا جائے تو اس پر تناقض کا حکم صرف اس صورت
میں لکایا جاسکتا ہے۔ جب کہ اس شے کی صرف ایک ہی علت ہو سکتی ہو۔ لیکن اگر اس کی متعدد علتیں ہوں
ایسی صورت میں اس کو کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری علت کی جانب نسبت دینے میں کوئی
تناقض نہ ہوگا۔ مثلاً اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ کاغذ کو پانی نے تر کیا اور کبھی یہ کہ اسے آگ نے تر کیا۔ اور کبھی
یہ کہ اسے مٹی نے تر کیا۔ تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے تناقض باتیں کہی ہیں، کیونکہ کاغذ کی تری تو ایک ہی

علت کی طرف منسوب ہو سکتی ہے لیکن اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ ملک کو بادشاہ نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ ملک کو سپہ سالار نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ اسے فوج نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ اسے سلطنت نے فتح کیا، اور کبھی اس فتح کو فرداً فرداً ہر سپاہی کی طرف منسوب کریں، تو ان مختلف اقوال پر تناقض کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ فتح کا واقعہ مجموعی طور پر ان سب کی طرف بھی منسوب ہو سکتا ہے، اور ایک ایک وجہ سے، ان علتوں میں سے ہر علت کی طرف بھی۔

پھر اگر کسی شے میں متعدد علتوں کی تاثیرات اس طرح خلطاً خط ہوں کہ مخاطب کی عقل کسی طور سے اسکے اندر ہر علت کی تاثیر کو جدا جدا کر کے، ہر ایک کا حصہ الگ الگ متعین نہ کر سکتی ہو، اور نہ ایسے کسی تجزیہ و تحلیل، اور اس طرح کے کسی حساب کو سمجھ سکتی ہو، تو اس صورت میں منکلم کے لئے صحیح انداز بیان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اجمال کے طور پر اس شے کو ایک ایک علت کی طرف منسوب کرے، اور اگر مخاطب کسی غلط فہمی کی بنا پر اس شے کو صرف ایک ہی علت کی جانب نسبت دے رہا ہو تو اس کی تردید کر دے۔ مثال کے طور پر اسی فتح کے واقعہ کو لیجئے۔ اس میں بادشاہ، سپہ سالار، فوج، سلطنت۔ اور فرداً فرداً ہر سپاہی کی قوتیں شریک ہیں۔ مگر وہ اس طرح باہم ملی جلی ہیں کہ ہم کسی تجزیہ و تحلیل اور کسی حساب سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اس واقعہ کے اندر ہر ایک کا حصہ کس قدر ہے۔ اس لئے زیادہ صحیح یہ ہو گا کہ اس واقعہ کو ان میں سے ہر ایک کی طرف بربیل اجمال نسبت دی جائے۔ اور اگر کوئی شخص ان میں سے محض کسی ایک کی طرف اس کو حصہ و تعیین کے طور پر منسوب کر رہا ہو۔ تو کہہ دیا جائے کہ اس کا قول غلط ہے۔

یہی حال انسان کے افعال کا ہے۔ ہر فعل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے اس میں متعدد اسباب شامل ہوتے ہیں، اور اس کے ظہور و صدور میں ہر سبب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر میں اس وقت لکھ رہا ہوں میرے اس فعل کتابت کا تجزیہ کیجئے تو اس میں اسباب کا ایک پورا سلسلہ آپ کو نظر آئے گا۔ مثلاً لکھنے کے لئے میرا اختیار و ارادہ، میرے اندر جو بے شمار ذہنی اور جسمانی قوتیں موجود ہیں ان سب کا اس

ارادہ کے تحت کام کرنا۔ اور خارجی قوتوں کا جو بے حد حساب میں اور جن میں سے بہت سی قوتیں میرے علم میں بھی نہیں ہیں، میری مساعدت کرنا۔

پھر ان اسباب کی الگ الگ تحلیل کیجئے۔ یہ بے شمار خارجی قوتیں جو اس وقت اس فعل میں میری مساعدت کر رہی ہیں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ میں نے بنایا ہے، نہ فراہم کیا ہے، نہ میں ان پر اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ انہیں اپنی مساعدت پر مجبور کر سکوں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان کو اس طور پر بنایا اور اس طرح فراہم کر دیا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ ساری قوتیں میری مساعدت کرنے لگتی ہیں۔ اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ میری مساعدت نہ کریں تو میں لکھ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب میں خود اپنے اوپر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا موجود اور زندہ ہونا، میرا حسن تقویم پر ہونا، میرے جسم کے ان اعضاء کا جو کتابت کے فعل میں حصہ لیتے ہیں، صحیح و سلامت ہونا میرے اندر ان طبعی قوتوں کا موجود ہونا جن سے میں اس فعل میں کام لیتا ہوں، اور میرے دماغ میں حافظہ، تفکر، علم اور دوسری بہت سی چیزوں کا پایا جانا، ان میں سے کوئی ایک میری کارائی کا نتیجہ ہے، نہ میرے اختیار میں ہے۔ ان سب کو بھی اسی عدل نے اس طور پر بنایا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ سب چیزیں میرا ساتھ دیتی ہیں، اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک شے میرا ساتھ نہ دے تو میں کتابت کے فعل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

رہا میرا اختیار و ارادہ تو اس کی حقیقت بھی میں نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پہلے کچھ خارجی اسباب اور کچھ باطنی اسباب سے میرے اندر لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے پھر میں غور کرتا ہوں کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ پھر دونوں پہلوؤں کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد میں لکھنے کے پہلو کو اختیار کرتا ہوں، اور جب میرا میلان فعل کی جانب قوی ہو جاتا ہے تو فعل کا ارادہ کر کے اپنے اعضاء کو اس کے لئے حرکت دیتا ہوں۔ اس خواہش سے لے کر اقدام فعل تک جتنی چیزیں ہیں ان میں سے

کسی چیز کا بھی میں خالق نہیں ہوں، بلکہ مجھے اب تک یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ خواہش اور اقدام فعل کے درمیان کتنی باطنی قوتیں کام کرتی ہیں۔ اور اس کام میں ان کا کتنا کتنا حصہ ہے۔ مگر یہ بات وجدانی طور پر میں اپنے اندر پاتا ہوں کہ خواہش اور اقدام فعل کے درمیان کوئی مقام ایسا ضرور ہے جہاں میں فعل اور ترک فعل میں سے کسی ایک چیز کو آزادانہ اختیار کرتا ہوں اور جب میں آزادی کے ساتھ کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتا ہوں تو مجھے یہ قدرت اپنے اندر محسوس ہوتی ہے کہ جس پہلو کو میں نے اختیار کیا ہے اس کے لحاظ سے اپنے وسائل و داخلی اور اسباب خارجی کو استعمال کروں میں اپنے اس اختیار اور آزادی ارادہ کو کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتا۔ مگر کوئی دلیل میرے اور کسی انسان کے ذہن سے اس وجدانی احساس کو دور نہیں کر سکتی جتنی کہ جو شخص اتہا و درجہ کا جبر یہ ہے۔ اس کا وجدان بھی اس احساس سے خالی نہیں ہے، خواہ وہ اپنے فلسفیانہ مسلک کی خاطر کتنی ہی شدت کے ساتھ اس کا انکار کرتا ہو۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ فعل کتابت کے صدور میں جتنے اسباب و علل کام کرتے ہیں ان کو تین جدا جدا سلسلوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کا فراہم ہونا کتابت کا ارادہ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔
۲۔ میرا کتابت کو اختیار کر کے اس کا ارادہ کرنا۔

۳۔ وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کی مساعدت کے بغیر لکھنے کے فعل کا صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تینوں سلسلوں میں سے پہلے اور تیسرے سلسلے میں جتنے اسباب ہیں ان کے متعلق تو اوپر

کہا جا چکا ہے کہ ان کو خدا نے فراہم کیا اور سازگار بنا یا ہے، اور ان میں سے کسی پر بھی میری حکومت نہیں

ہے۔ اس لئے ان کے اعتبار سے میرا فعل کتابت خدا ہی کی طرف منسوب ہوگا۔ جس کی توفیق اس کام میں

میرے شامل حال ہوئی ہے۔ رہی بیچ کی کڑی تو وہ ایک وجہ سے میری طرف منسوب ہوگی کیونکہ وہاں

میں نے ایک طرح کا آزادانہ اختیار اور ارادہ استعمال کیا ہے، اور ایک وجہ سے وہ خدا کی طرف مبوب ہوگی جس نے اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر مجھ میں یہ قوت پیدا کی کہ ارادہ کروں اور آزادی کے ساتھ اپنا اختیار استعمال کروں۔

یہ تو تھا مجرد فعل کا حالج اپنی حقیقت میں بجز ایک حرکت کے اور کچھ نہیں ہے لیکن انسانی افعال بعض اضافی اور اعتباری حیثیتوں سے اپنے دو پہلو رکھتے ہیں۔ ایک خیر کا پہلو اور دوسرا شر کا پہلو۔ مجرد فعل کا خیر کا حکم لگایا جاسکتا ہے اور نہ شر کا۔ البتہ انسان کی نیت اس کو شر بھی بنا سکتی ہے اور خیر بھی (اللہمَّ اَلْاَعْمَالَ بِالنِّيَّاتِ) مثال کے طور پر میں راستے میں ایک اشرفی پڑی ہوئی دیکھتا ہوں اور اسے اٹھالیتا ہوں۔ میرا اس کو اٹھالینا محض ایک حرکت ہے جو نیک اور بد دونوں حیثیتوں سے خانی ہے لیکن اگر اس اٹھالینے سے فعل میں میری نیت یہ ہے کہ میں دوسرے کے مال سے بلا کسی حق کے خود فائدہ اٹھاؤں تو یہ شر ہے۔ اور اگر میری نیت یہ ہے کہ اس کے مالک کو تلاش کر کے اسے واپس دیدوں تو یہ خیر ہے۔ صورت اول میں میری نیت کے ساتھ ایک اور قوت کی تحریک بھی شامل ہوگی

سہا یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن مجید میں ان تمام امور کو جو انسان کے اختیار سے باہر ہیں خدا کی طرف مبوب کیا گیا ہے، اور خود انسان کے اختیاری افعال کو بھی با اوقات خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ انسان جن افعال کو اپنے اختیار و ارادہ کے تحت انجام دیتا ہے وہ بھی خدا کی توفیق کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے تھی کہ خواہش بھی جو تمام افعال انسانی کا مبداء ہے، انسان کے اپنے بس کی چیز نہیں ہے۔ وہ ان اسباب و علل کے اثر سے پیدا ہوتی ہے جو مشیت الہی کے تحت حرکت کرتے ہیں یہی معنی میں **عَمَّا تَشَاءُونَ اَلَا اَنْزَلْنَا اللّٰهَ** اسی طرح جن افعال میں اپنی قوت تیز قوت فیصلہ اور قوت ارادی کو استعمال کرتا ہے، اور جن افعال کو وہ خوب سوچ کر تمام پہلوؤں کو جانچ کر انجام دیتا ہے ان کے اندر بھی اس کی پیدا شدہ اثرات اور اثرات اور تعلیم تربیت کی تاثیرات اور فراہم شدہ اسباب و علل کی مشیت اجتماعی کا بہت کچھ دخل ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں مل جل کر اس کے اختیار تیزی کو (جو خالصتہً اس کا اپنا ہے) اس حد تک متاثر کر دیتی ہیں کہ عمل کا جو ساتھ بھی وہ انتخاب کرتا ہے وہ محض اس کے اپنے انتخاب کا نتیجہ نہیں ہوتا اب یہ ظاہر ہے کہ ان عوامل کا اثر نفس کی زندگی میں ہر موقع پر ایک خاص مشیت کے ساتھ مجتمع ہونا جس پر اس شخص کی ہدایت و ضلالت کا میانی اور ناکامی کا بہت کچھ انحصار ہے، خدا ہی کی مشیت پر موقوف ہے پس یہ خدا کا عین انصاف اور بندوں پر اس کا عین فضل ہے کہ اس نے انسان کے خطا و صواب، نگرانی اور راست روی، فلاح اور خسران کی ذمہ داری تنہا انسان پر نہیں ڈالی ہے۔ بلکہ ایک وجہ سے ان تمام امور کو اپنی مشیت پر بھی بنی قرار دیا ہے۔

جس کو شیطان کے نام سے موصوم کیا جاتا ہے، اور میرا فعل تین علتوں کی طرف منسوب ہوگا۔ ایک خدا، دوسرے شیطان، تیسرا خود میں صورت دوم میں اس فعل کی نسبت دو علتوں کی جانب ہوگی۔ ایک خدا دوسرا میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر انسانی فعل کو دو یا تین علتوں کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ فعل میں ان دو یا تین علتوں کی تاثیر کس کس مقدار میں ہے خصوصاً یہ حساب اس حیثیت سے اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ ان تاثیرات کا تناسب تمام انسانوں کے افعال میں یکساں نہیں ہے، بلکہ ہر انسان کے فعل میں جداگانہ ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان کے اندر اس کے آزادانہ اختیار اور اس کی مجبوریوں کی مقدار مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی مبداء فیاض سے زیادہ زبردست قوت تمیز زیادہ صحیح قوت فیصلہ، ملکوتیت کی جانب زیادہ قوی میلان، اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنے کی زیادہ قوت لے کر آیا ہے، اور کوئی کم۔ اور اسی کمی و زیادتی پر جس کا تناسب ہر شخص کے اندر مختلف ہے، افعال میں انسان کی شخصی ذمہ داری کے کم یا زیادہ ہونیکا انحصار ہے، ایسی حالت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ افعال میں انسان خدا، اور شیطان کی تاثیرات کا کوئی ایسا تناسب بتایا جاسکے جو عمومیت کے ساتھ تمام انسانی افعال میں پایا جاتا ہو۔

پس جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انسانی افعال کو ان کی علتوں کی طرف نسبت دینے کی صحیح صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اجمال کے طور پر ان کو یا تو بیک وقت تمام علتوں کی طرف منسوب کیا جائے یا کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری علت کی جانب اور اگر کوئی شخص غلط فہمی سے ان کو صرف ایک علت کی طرف نسبت دے کر دوسری علتوں کی نفی کرتا ہو تو اس کی تردید کر دی جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے اگر آپ ان اشارات کا تتبع کریں، جو قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر کی طرف کئے گئے ہیں۔ تو ان کو حسب ذیل عنوانات کے تحت مرتب کر سکتے ہیں

نسبت کل افعال الی اللہ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو بقرہ ۱۲-۱۳-۲۰-۲۶- آل عمران ۱۶-

۱۷- نساء- ۱۱- انعام ۳ رعد- ۲- ابراہیم- ۱- فاطر- ۲- شوریٰ- ۲- فتح- ۲)

نسبت خیر الی اللہ (بقرہ ۱۷-۳۴- نساء- ۱۱- مائدہ- ۸- انعام- ۱۵)

نسبت خیر الی العباد (بقرہ ۳۸- آل عمران ۶- فاطر ۳- زمر ۴- احقاف ۲- نجم ۳- دہر

نبار ۲- مزمل ۱-)

نسبت شر الی اللہ (نساء ۱۲- مائدہ ۶- انعام ۱۵- بنی اسرائیل ۵-)

نسبت شر الی الشیطان- (بقرہ ۳۴- وغیرہ)

نسبت شر الی العباد (بقرہ ۱- ۴- ۵ تا ۹- ۱۳- ۱۵- ۲۱- آل عمران ۶- ۷- ۱۲-

۱۷- ۱۸- نساء- ۱۱- مائدہ- ۱۰- ۱۱- انعام ۱- ۲- ۱۳- ۱۵- اعراف ۲- انفال ۷- ۸-

توبہ ۹- یونس ۲- رعد ۲- فاطر ۳- زمر ۳- ۴- ۷- حم سجدہ ۲- حدید ۴- تحریم ۱-

نبار ۲- فجر- زلزال ۱-)

ایک ہی شے کی نسبت خدا اور بندہ کی جانب (بقرہ ۱۲- آل عمران ۱۷- نخل ۳۱- طہ ۳)

ایک ہی شے کی نسبت خدا اور شیطان کی جانب (بقرہ ۳)

خیر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے (رعد ۴- نخل ۱۴- حج ۷-

عنکبوت ۷- محمد ۲- تکویر- اعلیٰ- لیل ۱-)

شر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے (بقرہ ۱- ۲- نساء ۲۲-

اعراف ۱۳- ۱۷- انفال ۷- توبہ ۱۶- رعد ۲- صفت ۱-)

پھر جہاں انسان نے اپنے گناہ کی ذمہ داری خدا پر ڈال کر خود بری الذمہ ہونا چاہا

وہاں اس کی تردید کر دی گئی۔ مثلاً۔

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ مَالَهُمْ
يَذُوكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ
(۲:۲۳)

اور انہوں نے کہا کہ اگر رحمن چاہتا تو ہم ان فرشتوں
کی پرستش نہ کرتے، لیکن ان کو اس معاملہ (شیت الہی)
کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ محض اٹکل سے یہ باتیں کہتے ہیں۔

وَإِذْ أَعْلَوْا فَاجْتَنَّةَ قَالُوا وَوَحَدْنَا
أَبَاءَنَا عَابَيْهَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ
إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ اتَّقُوا
عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۳:۷)

اور جب انہوں نے کوئی بڑا کام کیا تو کہا کہ ہم نے
اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ
نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ اے پیغمبران سے کہدے کہ
اللہ بڑی باتوں کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے بارے
میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تم کو علم نہیں ہے۔

اور جہاں انسان نے اپنی ہی تدبیر کو سب کچھ سمجھا اور تقدیر الہی کا انکار کیا وہاں اس کی
بھی تردید کر دی گئی مثلاً

يَقُولُونَ لَوْ كَان لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا
قُتِلْنَا هَاهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ
لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى
مَضَاجِعِهِمْ (۱۶:۳)

وہ کہتے ہیں کہ اگر معاملات کے طے کرنے میں ہمارا بھی
کوئی حصہ ہوتا تو ہمارے آدمی وہاں (میدان جنگ
میں) نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبران سے کہو کہ اگر تم اپنے
گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا لکھ دیا گیا
ہے وہ اپنے پھرنے کی جگہوں پر خود جا پہنچتے۔

حقیقت کی پر وہ کشائی | اس بحث سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ قرآن مجید میں سئلہ جبر و قدر کے متعلق
جو اشارات مختلف مواقع پر کئے گئے ہیں، ان میں درحقیقت کوئی تناقض و تعارض نہیں ہے لیکن ایک
پھر بھی باقی رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ مخلوقات عالم میں انسان کی وہ کونسی امتیازی حیثیت ہے جس کے
محاطے سے ایک طرف تو وہ تمام موجودات کی طرح خدا کا محکوم ہے قوانین خداوندی میں جکڑا ہوا ہے، بندہ

مجبور ہے۔ اور دوسری طرف اپنے افعال میں مختار بھی ہے، اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہے، اپنی حرکات و سکنات کے لئے جواب دہ بھی ہے۔ جزا اور سزا کا مستحق بھی ہے؛ نیز جب انسان کا حال یہ ہے اور اس کی زندگی میں جبر اور اختیار اسی طرح ملے جلے ہیں، تو عدل کیونکر ممکن ہے؟ اس لئے کہ صحیح انصاف کے ساتھ جزا و سزا کا فیصلہ کرنا بغیر اس تحقیق کے ممکن نہیں ہے کہ اس کے افعال کی ذمہ داری خود اس کے کس حد تک ہے؟ اور ذمہ داری کی تشخیص بغیر یہ معلوم کئے نہیں ہو سکتی کہ اس کے افعال میں اس کے آزادانہ اختیار کا کتنا حصہ ہے؟ اس مسئلہ کی تحقیق کیلئے جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے ہم کو ایک ایسا تشفی بخش جواب ملتا ہے، جو دنیا کی کسی دوسری کتاب، اور دنیا کے کسی انسانی علم و فن سے نہیں ملتا۔

مخلوقات میں انسان کی امتیازی حیثیت | قرآن ہمیں خبر دیتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے کائنات میں مخلوقات کی اتنی ہی انواع موجود تھیں وہ سب اپنی فطرت کے لحاظ سے اطاعت کیش واقع

ہوئی تھیں۔ اختیار اور ارادہ کی قوت سرے سے ان کو دی ہی نہیں گئی تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جس کے سپرد جو خدمت کر دی گئی ہے، اس کو وہ ایک قانون اور ایک نظام کے مطابق، ذرہ برابر سرکشی کے بغیر جاتا رہے۔ ان میں سب سے افضل مخلوق فرشتے تھے جن کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۱: ۲۶) اسی طرح اجرام فلکی کی عظیم الشان ہتیاں تھیں جن کا حال یہ تھا۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ وَالْقَمَرَ قَدْ رَزَقْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ۔ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الْبُرُجُ النَّهَارُ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲: ۳۶)۔ یہی حال آسمان وزمین کی دوسری مخلوقات کا تھا۔ کہ كُلٌّ لَهَا قَانِتُونَ (۳: ۳۰) اور لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ، يَسْبَحُونَ أَلَيْدًا وَ النَّهَارَ لَا يَفْتَرُونَ (۲: ۲۱)۔

پھر اللہ نے چاہا کہ اپنی بنائی ہوئی مخلوقات میں سے کسی کو اپنی وہ امانت پرچکے جو اس وقت تک کسی کو نہ دی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے وہ امانت آسمان اور زمین کی مخلوقات میں سے ایک ایک کے سامنے پیش کی اور ہر ایک نے زبان حال سے اپنی ناقابلیت اور اپنے عدم تحمل کا اقرار کیا۔ آخر کار اللہ نے اپنی تخلیق کا جدید ترین ایڈیشن نکالا جس کا نام انسان ہے اور اس نے بڑھ کر وہ بار امانت اٹھالیا جس کے اٹھانے کی صلاحیت اور ہمت کسی دوسری مخلوق میں نہ تھی۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا
وَآشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (۳۳: ۱۹)۔

یہ امانت کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ کی ان مخصوص صفات، علم، قدرت، اختیار، ارادہ اور فرمانروائی، کا پر تو جو اس وقت تک کسی مخلوق پر نہ ڈالا گیا تھا۔ جس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ فرشتوں میں تھی، نہ اجرام فلکی میں، نہ پہاڑوں میں نہ زمین و آسمان کی کسی اور مخلوق میں۔ وہ صرف انسان تھا جو اپنی فطرت کے لحاظ سے اس پر تو کا تحمل ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے یہ بار امانت اٹھالیا۔ اور اسی لئے وہ اللہ کی خلافت و نیابت کے منصب پر سرفراز ہوا۔ اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (۲: ۳۰)۔ اس بار امانت کے حامل، اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت، جس کی بنا پر وہ دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے، یہ ہے کہ وہ طبعاً اطاعت کیش نہیں بنایا گیا ہے۔ اس کو عام مخلوقات کی طرح نظام علی کے تحت قوانین و حدود الہیہ کا پابند بنانے کے ساتھ، ایک ایسی قوت بھی عطا کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ بخلات دوسری مخلوقات کے، ایک خاص دائرہ میں مجبوراً نہ طاعت سے آزاد ہے، اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی و نافرمانی کرنے لگے۔ یہ ایسا فرق ہے جو کلام

لے یہ بات متعدد آیات قرآنی سے ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ الْمَن فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جُنُودًا (۱۰: ۱۱) اور وَ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا (۶: ۱۳) وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان کو بجز شرک سے روکے اور ایمان پر مجبور کرے۔

اتنی میں تدبیر کرنے والے کو صاف نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں آپ کو انسان کے سوا کسی اور ایسی مخلوق کا نشان نہ ملے گا جس کی طرف طاعت اور عصیان، فرمانبرداری اور نافرمانی، حدود و احکام کی پابندی اور ان حدود سے تجاوز و دونوں کو نسبت دی گئی ہو، اور جس کی طاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا ذکر کیا گیا ہو۔ وہ انسان ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲: ۲۹) وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ (۱۰: ۷) يُرِيدُونَ أَنْ يُتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ (۴: ۹) مَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۷: ۲۰) وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ... وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا. (۴: ۲)۔ یہ اور ایسی ہی بے شمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں نخلات دوسری تمام مخلوقات کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے۔ اور اسی قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے فوز یا خسران، ثواب یا عقاب، انعام یا غضب کا متحق ہوتا ہے۔

ہدایت و ضلالت | قرآن اس مسئلہ کو اور زیادہ کھول کر بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں پہلے اور برے دونوں کی تیز روایت فرمادی فَالْتَمَمَّا فُجُورًا هَا وَتَقْوَانَهَا. (۹۱) اس کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے بتا دے وَ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰) پس کو اختیار دیدیا کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا. (۲: ۷) اور فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۸: ۴) ایک طرف اس کو بہکانے کے لئے اس کا ازلی دشمن شیطان موجود ہے جو بدی کی راہ کو فرین کر کے اسے دکھاتا اور اس کی طرف رغبت دلاتا ہے۔ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَا أَغْوِيَهُمْ

اجْمَعَيْنَ (۱۵: ۳) اور دوسری طرف اللہ کی جانب سے رسول بھیجے جاتے ہیں، کتاب میں نازل کی جاتی ہیں تاکہ انسان کو نیکی کا سیدھا راستہ بدی کی راہ سے ممتاز کر کے دکھائیں۔ جَاءَ تَهُمُ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالذُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۲۵: ۳)۔ اس طرح انسان کے اندر اور اس کے گرد و پیش مختلف قوتیں ہیں جن میں سے کوئی اس کو بدی کی طرف کھینچنے والی ہے اور کوئی نیکی کی طرف ان قوتوں کے درمیان موازنہ کرنے کے لئے اس کو سمجھ بوجھ دی گئی ہے۔ اپنی راہ آپ دیکھنے کے لئے آنکھیں دی گئی ہیں، اور اتنی قدرت دی گئی ہے کہ وہ جس راہ کو پسند کرے اس پر چل سکے، اگر وہ بدی کی راہ کو اختیار کرتا ہے، تو افسوس کی تمام طبعی قوتوں، اور ان خارجی اسباب کو جو اس کے نصیب میں لکھدے گئے ہیں اس کا تابع فرمان بنا دیتا ہے، اور یہ راہ اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ راہ بھی اس کے لئے آسان کر دی جاتی ہے۔ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنِيسِرُهُ لِلْيُسْرَىٰ وَأَمَّا مَنْ خَلَّٰ وَاسْتَفْتَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ فَسَنِيسِرُهُ لِّلْعُسْرَىٰ (۹۲) جو شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اس کے ضمیر میں ایک الہی قوت پھر بھی موجود رہتی ہے جو اس کو راہ راست کی طرف دعوت دیتی رہتی ہے، مگر جب وہ اپنی کج روی پر اصرار کرتا ہے تو یہ قوت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے، اور ضلالت کی بیماری بڑھتی جاتی ہے۔ فَنِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا (۲: ۲) یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے۔ جب اس قوت کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور اس شخص کے دل، آنکھوں، اور کانوں پر ایسی مہر لگ جاتی ہے کہ وہ حق بات کو سمجھ نہیں سکتا، حق کی روشنی کا ادراک نہیں کر سکتا، حق کی آواز سن نہیں سکتا، اور ہدایت کے تمام راستے اس کے لئے بند ہو جاتے ہیں، خَتَمَ اللَّهُ عَن قُلُوبِهِمْ وَ عَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (۱: ۲)

مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انسان کا اختیار اور اس کی آزادی غیر محدود ہے۔

اور اس کو کلیتہً وہ اختیارات تفویض کر دے گئے ہیں جو قدریہ نے فرض کر لئے ہیں۔ ہرگز نہیں انسان کو جو کچھ اختیار دیا گیا ہے وہ یقیناً ان قوانین کے ماتحت ہے جو اللہ نے تدبیر کئی اور تدابیر جزئیہ کے لئے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے تحت یہ سارا کارخانہ قدرت چل رہا ہے۔ کائنات کے نظام میں انسان کی قدرت، اور اس کی روحانی، انسانی اور جسمانی قوتوں کے لئے جو حدود اللہ نے قائم کر دی ہیں ان سے وہ ایک بال برابر بھی تجاوز کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اِنَّا خَلَقْنَا كُلَّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ (۲: ۵۴) اور اِنَّ اللّٰهَ بَالِغٌ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۱: ۶۵) اور وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۲: ۶)

عدل اور جزا و سزا ہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا بجز خدا کے اور کوئی نہیں دیکھتا، اس لئے کہ وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے خدا ہی کی قائم کی ہوئی ہیں اور خدا ہی اس حقیقت کا جاننے والا ہے کہ انسان کے اعمال میں اس کے اپنے اختیار کا حصہ کتنا ہے اس نے جن حدود سے انسان کے اختیار کو محدود کیا ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کے حدود وہ ہیں جو تمام نوع بشری کے لئے من حیث المجموع قائم کئے گئے ہیں۔ اور دوسری قسم کے حدود وہ ہیں جو ہر شخص کے لئے فرداً فرداً مختلف طور پر مقرر ہیں۔ پہلی قسم کے حدود نوعی حیثیت سے تمام اولاد آدم کے اختیار کو محدود کرتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے حدود ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں، اس لئے ان کے اختیار سے ہر شخص کی زندگی میں اس کے اختیار اور اس کی مجبوری کی مقدار جدا جدا ہیں۔ اپنے اعمال کے لئے انسان کا ذمہ دار ہونا اور اس ذمہ داری کے لحاظ سے جزا و سزا کا مرتب ہونا اسی مقدار اختیار پر موقوف ہے جس کو ہر شخص نے اپنے افعال میں استعمال کیے، اور یہ وہ چیز ہے جس کو تولدنا جانچنا، اور ایسا ٹھیک ٹھیک حساب لگانا کہ ایک ذرہ بھر بھی کسی وبیشی نہ ہو، دنیا کے کسی جج اور کسی مجسٹریٹ کے بس کا کام نہیں ہے یہ محاسبہ و موازنہ صرف

فاطر السموات والارض ہی کرتا ہے اور وہی قیامت کے دن اس عدالت کا اجلاس کرے گا۔ یہی بات ہے جس کی طرف کلام اللہ میں جگہ جگہ اشارہ کیا گیا ہے۔

وَالْوَشْيٰنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ
مَوَازِينُهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ
مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِينَ
خَسِرُوا۟ اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا يٰٓاِيْتٰ
يٰٓاِيْتٰ
آیات کے ساتھ ظلم کر کے اپنے آپ کو خود نقصان پہنچا یا ہے۔

ان کو ہماری ہی طرف آنا ہے اور ان کا حساب و کتاب
ہمارے ہی ذمہ ہے۔

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ
مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (۱۹)

جو ذرہ برابر نیک عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا
اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا

قرآن مجید سے مثل جبر و قدر پر بسا ہی حد تک روشنی پڑتی ہے اور اس سے وہ گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جو علوم طبیعیہ اور علم الاخلاق کے باعث میں بیان کی گئی ہیں۔ رہے وہ ما بعد الطبعی مسائل جن میں فلاسفہ اور متکلمین الجھتے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ اللہ کے علم اور اس کی معلومات، اس کی قدرت اور اس کے مقدرات، اس کے ارادہ اور اس کے مرادات میں کس نوع کا تعلق ہے، اور اس کے علم سابق ارادہ ازلی اور قدرت مطلقہ کے ہوتے ہوئے انسان کس طرح با اختیار اور اپنے ارادہ میں آزاد ہو سکتا ہے تو ان مسائل سے قرآن نے کوئی بحث نہیں کی ہے، اس لئے کہ انسان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔